سترہواں سفر ۔ کراچی سے لاہور تبادلہ

ہمارے شوہر ذاکر صاحب نے ہمارے بچّوں کے امتحان ختم ہوتے ہی ہمیں لاہور آنے کے لئے پیغام بھیجا۔ ہم نے گھر کی اکثر چیزیں بیچ دیں۔ اب رامپور جیسا تو ماحول نہ تھا کہ ہم کسی کے خیالات کا خیال رکھتے۔ رامپور چھوڑتے وقت ہم نے کوئی بھی چیز نہیں بیچی تھی اور ہر چیز کسی نہ کسی کو تحفۃً دے کر آ گئے تھے۔ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد ہمیں دوسرے لوگوں کی طرح پیسے کی زیادہ قدر آ گئی تھی۔ پھر بھی تھوڑی ہی چیزیں بک سکیں۔ بڑے صاحبزادے نجم اپنا امتحان دے کر کیڈٹ کالج پٹارو سے کراچی آ گئے تھے، اور منجھلے بیٹے شمس نے مقابلہ کا مڈل اسکول امتحان دے دیا تھا جو کراچی کے تعلیمی بورڈ کی جانب سے منعقد ہوتا تھا۔ ہم نے سب کی سندیں اور امتحانی نتائج ساتھ لئے اور لاہور کے لئے تیز گام لی جو اس وقت کی تیز ترین ریل گاڑی تھی۔

لاہور پہنچے تو اسٹیشن پر ذاکر صاحب نے ہمارا استقبال کیا۔ زمانہ بدل چکا تھا اور ٹیلیفون عام تو نہیں ہوئے تھے، لیکن آپ پھر بھی اگر کسی کو کوئی پیغام بھجوانا چاہیں تو فون مل جاتا تھا کیونکہ پاکستان میں ٹیلیفون آپریٹر کے بغیر فون کا STD انتظام شروع ہو چکا تھا۔ لاہور کے سنت نگر کے علاقے میں ایک نئی عمارت کی دوسری منزل پر چار کمروں کا مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔ اسٹیشن سے سارا سامان دو تانگوں میں رکھ کر سنت نگر تک لائے کہ لاہور میں ابھی بھی تانگے چلتے تھے۔ ذاکر صاحب نے گھر پہلے ہی سے سجایا ہوا تھا، پلنگ، چادریں وغیرہ قرینے سے لگی تھیں۔ اتنے سال گزر گئے تھے لیکن ذاکر صاحب کا فوجی معیارِ پختگی ابھی بھی ویسے کا ویسا ہی تھا۔

یہاں شمس مسلم ماڈل اسکول سے ہوتے ہوئے، سینٹرل ماڈل اسکول میں داخل ہو گئے۔ تیسرے

بیٹے قمر اور چوتھے اعزاز قریب ہی خزانہ گیٹ ملتان روڈ پر واقع اسلامیہ ہائی اسکول میں آ گئے۔ دونوں بڑی لڑکیوں کو بھی لیڈی میکلیگن اسکول میں داخلہ مل گیا تھا۔ یہ پرانی انارکلی کے قریب کچہری روڈ پر واقع تھا۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ اُن کی عمر کا مسئلہ تھا کہ ہمارے پاس ان کی تاریخِ پیدائش کی سند نہیں تھی۔ اِسکول کی انتظامیہ نے اصول کے مطابق اِن کی کلائیوں کے ایکسرے کراوئے اور کسی گزیٹیڈ افسر سے "سند" کے لئے ایک رقعہ لانے کو کہا۔ اب یہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر ایکسرے جیسی معتبر سائینسی سند ہے تو پھر رقعہ کی کیا ضرورت؟ لیکن پاکستان میں یہ رواج انگلستانی حکمران چھوڑ گئے تھے اور یہ ابھی بھی ہے۔ غرض ہمارے شوہر کے ایک جاننے والے ڈاکٹر واحدی پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ان کے بھائی ڈاکٹر واحدی رامپور سے ہمارے واقفکار تھے اور اب کراچی میں بھی ہمارا ان سے میل جول تھا۔ ان وائس چانسلر واحدی کے پاس گئے اور ایک رقعہ لیا جس کے مطابق وہ ہمیں جانتے تھے اور یہ کہ بچوں کی عمر واقعی اتنی ہی تھی جتنی کہ ہم اور ایکسرے بتا رہے تھے۔ بعد میں یہی طریقہ کار ہم نے امریکہ کی ہجرت کے وقت امریکیوں کے کام میں دیکھا۔

لاہور میں سنت نگر کے اس گھر میں پانی صرف مقررہ اوقات میں آتا تھا۔ صبح ۸/ سے ۱۲/ بجے تک اور شام ۴/ سے ۸/ بجے تک۔ آپ پانی بھر کر رکھ لیں اور استعمال کرتے رہیں۔ کپڑے دھونا ہوں تو وہ بھی اسی وقفہ میں ورنہ پانی جمع کرنے کے لئے پانی کی ٹنکیاں آتی تھیں لیکن ان میں پانی اتنا نہیں جمع کر سکتے تھے کہ اس سے کپڑے دُھل سکتے۔ نہانے کے لئے بھی یہی وقت مقرر تھا۔ اس دومنزلہ عمارت میں تین گھر اوپر کی منزل پر تھے اور دو نیچے کی منزل پر۔ ہمارے گھر کے نیچے دکانیں تھیں۔ پانی کا ایک موٹر تھا اور اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ سب گھروں میں ایک ساتھ پانی بھیج سکتا۔ لہذا انتظام اسی طرح کا تھا۔ اوپر کی چھت کو اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ ہر کرایہ دار کا ایک الگ حصّہ تھا۔ ہم گرمیوں میں کھلے آسمان کے نیچے سوتے تھے۔ کبھی آندھی یا بارش آئی تو پورے محلّے میں آس پاس کی تمام چھتوں پر ایک ہنگامہ ہو جاتا تھا۔ تماشہ اس طرح کا ہوتا کہ سب لوگ اپنے بستر لپیٹ کر بغل میں دباتے اور بھاگتے نیچے کی طرف۔ اسی طرح جب پتنگ بازی کے مقابلے ہوتے اور پتنگیں کٹ کر آتیں تو پورے محلّے کے بچے اور نوجوان سب ہی بھاگتے ہوئے ہماری چھت پر پہنچتے، اور اگر وہاں سے پتنگ کہیں اور چلی گئی ہو تو پھر سیڑھیوں سے نیچے اور بھاگتے ہوئے دوسرے گھر کی سیڑھیوں سے اوپر۔ پتنگوں کے سلسلے میں لڑائیاں بھی ہوتیں، اور کبھی تو چھری چاقو سے ہوتی تھیں۔ یہاں تانگے بھی اس قدر کہ اللہ کی پناہ۔ نہ گھوڑوں کی غلاظت کے لئے کوئی قانون، اور نہ ہی تانگوں کو کھڑا کرنے کا کوئی نظام۔ گھر

کے سامنے ہی بازار تھا اور ادھر ہی تانگوں کا اڈّہ۔ سڑک بیچ ایک چھوٹا سا تالاب جس میں سب گھوڑے پانی پیتے تھے، جیسے کہ پرانی کاؤبوائے فلموں میں دکھایا جاتا ہے، مگر یہ لاہور کا سنت نگر تھا ۱۹۶۵ء میں۔ ساری رات تانگوں کی ٹن ٹن اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی دیتی تھی۔ گھر لیتے وقت ذاکر صاحب کو اندازہ نہیں تھا اس صورتحال کا۔ بس کیونکہ گھر نیا تھا اور اچھا تھا، لہذا ان کو پسند آ گیا تھا۔ غرض اب اس گند کو دیکھ کر گھر تلاش کرنے نکلے تو پتہ چلا کہ پورا لاہور ہی ایسا ہے، سوائے سمن آباد اور گلبرگ کے۔ یہ دونوں جگہیں بچوں کے مدارس اور ذاکر صاحب کے دفتر سے بہت دور تھیں لہذا سب کو وہاں جانے پر اعتراض تھا۔

اسی دوران لاہور ٹیلی ویژن سے سیاہ وسفید فلمیں آنے لگی تھیں۔ بچوں اور بڑوں کو جنگل جم اور اسٹنگر ے پروگرام پسند تھے، اور اردو میں آلو چے والا، سچ گپ اور الف نون جیسے پروگرام آ گئے تھے۔ پنجابی کے پروگراموں میں ٹاہلی تھلّے کے پَھتو مشہور تھے۔ لیکن ٹیلی ویژن بہت کم گھرانوں میں آیا تھا اور اچھے پروگرام والے دن اہلِ ٹیلی ویژن گھروں میں ان کے دوست احباب اس طرح جمع ہو جاتے جیسے امریکہ میں ہم فٹبال کے میچ والے دن سب کو جمع ہوتے دیکھتے ہیں۔ رات گئے ہو ہا ہوتی اور سب دیر سے گھر واپس آتے۔ اسی طرح کی ایک محفل سے واپسی پر ایک شام ہم مال روڈ پر گول باغ کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ کچھ نوجوان بھی وہاں سے گزرے۔ لباس اور چال ڈھال سے لگتا تھا کہ یہ لاہوری نہیں تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان زمزمہ توپ کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا، ''او جنڑاب، اِینا لوکاں نے لہورنوں پیرس بنا چھڈیا اے'' (''جناب، ان لوگوں نے لاہور کو پیرس بنا کے رکھ دیا ہے'')۔ ہم اس کی رائے سے بہت متاثر ہوئے اور تیز چلتے ہوئے کوشش کرتے رہے کہ زیادہ زور سے سانس نہ لیں کیونکہ گرمی بہت تھی اور شیر شاہ سوری روڈ کی طرف سے ڈبل ڈیکر بسوں کا دھواں اور تانگوں کے گھوڑوں کی غلاظت اڑ کر فضا کو پرفضا بنائے ہوئی تھی۔ اتنے میں دوسرا بولا، ''او سئی اے، جنیں لہور نئیں ویکھیا، او جمیا ای نئیں'' (''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا'')۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب ہماری پیدائش کی سند میں کوئی شبہ نہیں رہا، اور جلدی سے آگے بڑھ گئے۔

ہم ۶ / جون ۱۹۶۵ء کو لاہور پہنچے تھے۔ پورے تین ماہ بعد، ۶ / ستمبر کی صبح کو سو کر اٹھے تو ریڈیو، اخبار اور تمام لوگ ہندوستان کے پاکستان پر حملہ کا ذکر کر رہے تھے۔ پھر پرانی یادیں ذہن میں گھومنے لگیں۔ ہم

لوگ مطمئن ہو گئے تھے کہ پاکستان بن گیا، بس رہو سہو، تعلیم حاصل کرو، کام کاج کرو، ملازمت، تجارت، اور خاندان سنبھالو۔ بھول گئے تھے کہ دشمن سوئے نہ سونے دے۔ سارے شیشوں پر موٹے موٹے کاغذ چڑھے اور رات کو روشنی جلانا جرم ہو گیا۔ ساری ساری رات بجلی بند، اندھیرا گھپ اور بلیک آؤٹ۔ لیکن تین یا چار دنوں میں چاند اتنا بڑا ہونے لگا کہ ہم دور کے گھر بھی اپنی کھڑکی سے اچھی طرح دیکھ لیتے تھے۔ ہم سوچتے تھے کہ اسی طرح ہندوستانی جہاز بھی ہمارے گھروں کو دیکھ سکتے ہونگے۔ لیکن اپنی رفتار اور بلندی کی بناء ہوسکتا ہے کہ وہ اتنی صفائی سے نہ دیکھ سکتے ہوں۔ رات گئے ہم کھڑکی سے سر لگا کر سوچتے رہتے۔ ہماری ساس ہم سے پوچھتیں، ''ارے کیا سوچ رہی ہو؟''۔ ہمارے پاس اس کا جواب نہ ہوتا کہ نظروں کے سامنے گرتے ہوئے بموں کی تیز روشنی اور کانوں میں ان بموں کے دھماکے ہر وقت ہمارے ساتھ تھے۔

قوم میں پاکستان کی قومیت جگانے میں موسیقی کا بہت ہاتھ رہا۔ ان گانوں کی موسیقی پر مولویوں نے اعتراض نہیں کیا۔ موسیقاروں نے موسیقی اور گلوکاروں نے اپنی آواز ملک اور فوج کے نام کر دی۔ نسیم بیگم کا نغمہ، ''اے راہِ حق کے شہیدو! تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں'' ہمارا پسندیدہ تھا۔ نور جہاں، مہدی حسن اور مسعود رانا کے نغمے مشہور ہوئے ..... ''اے وطن کے سجیلے جوانوں، میرے نغمے تمہارے لئے ہیں'' - یا- ''اے مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقتِ شہادت ہے آیا'' -اور- ''جنگ چھیڑ دیاں زنانیاں نے''، وغیرہ۔ اِس آخری نغمے کی بہت دھوم تھی۔ سنا گیا تھا کہ پاکستان کی سرحد پر پاکستانی فوجی اس گانے کو بجاتے ہوئے لاؤڈ اسپیکر کا رخ ہندوستان کے فوجیوں کی طرف کر دیتے تھے اور گانا ختم ہونے سے پہلے دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہو جاتی تھی۔ یہ بھی سنا گیا کہ چند گانے اتنے اچھے تھے کہ ہندوستانی سپاہی بھی ان کی فرمائش بھیجتے تھے۔

قوم نے فوج کا ہر طرح سے ساتھ دیا۔ بچوں نے اپنی جیب خرچ کی رقم فوجیوں کے حوالے کی اور بڑوں نے اپنے بنک اکاؤنٹ اور دل ان کے لئے کھول دیئے۔ کچھ لاہوری جیالے مذاق میں کہتے تھے کہ وہ اِس شو کے پیسے دے رہے تھے جو پاکستانی فضائیہ کے جہاز انہیں دکھاتے تھے۔ اِس شو کو دیکھنے سارا دن بچے چھتوں پر چڑھے ہوئے لڑاکا ہوائی جہازوں کی فضائی جنگ دیکھتے رہتے اور نیچے سے پاکستانی ہوابازوں کی فتح کے لئے نعرے لگاتے رہتے۔ ایک دن شام ۴/ بجے کے قریب ہندوستان کے تین یا چار جہاز نظر آئے اور ساتھ ہی سائرنوں نے کانوں کے پردے اُڑانا شروع کر دیئے۔ ان جہازوں کے پیچھے ۴/ پاکستانی لڑاکا

طیارے، جن میں سے تین F-86 سیبر جہاز تھے اور چوتھے کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ اوپر آسمان پر یہ لڑائی ہو، اور نیچے قوم زور زور سے نعرے مارے۔ خبروں اور نغموں کے ساتھ اعلان کیا جاتا کہ اس طرح چھتوں پر کھڑے ہونے سے پاکستانی ہوابازوں کو گولیاں چلانے میں ہچکچاہٹ ہوتی تھی اور انہیں خود کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ ان اعلانات کے بعد کچھ لوگوں نے اوپر جانا بند کیا، لیکن اکثریت کا جوش وخروش اس قدر تھا کہ ان کو روکنا ناممکن تھا۔ ان لوگوں کے لئے یہ بسنت کی پتنگ بازی جیسا دلچسپ ہنگامہ لگتا تھا۔ شام تک ایئر فورس پائلٹ محمد عالم کا نام ریڈیو پر لیا جا رہا تھا کہ انہوں نے بہت جہازوں کو گرایا تھا۔ یہ بھی خبریں آئیں کے کئی گھروں کی چھتوں پر استعمال شدہ گولیاں گریں، اور کئی گھروں کی دیواروں پر گولیوں نے سوراخ کر دیئے تھے۔ ہمارے شوہر کے دفتر کی عمارت کو خفیف سا نقصان ہوا۔ لوگ بچ گئے تھے لیکن دیواریں اطلاع دے رہی تھیں کہ یہاں گولیاں لگی تھیں۔ اسی زمانہ میں یہ بھی اعلانات ہوئے کہ ہندوستان نے پاکستان میں فقیروں کے بھیس میں جاسوس بھیجے تھے، جیسے کہ ٹیلی ویژن کے سائیں اختر اور الہٰ فقیر۔ اب لوگ داڑھی والوں پر شک کرنے لگے۔

ہماری ساس کافی ضعیف تھیں اور ان سے جنگ کے یہ حالات برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ ہمارے پڑوس کی ایک صاحبہ نے ہم سے اپنے کراچی جانے کے ارادے کا ذکر کیا تو ہم سب نے سوچا کہ اپنی ساس کو بھی کراچی بھیج دیا جائے۔ وہاں سے سرحد دور تھی اور اس وقت ہندوستانی بحریہ اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی۔ ہماری ساس راضی ہوگئیں۔ ریل رات کے ۸/ بجے جا رہی تھی۔ اب اسٹیشن کی طرف چلے تو ہر طرف اندھیرا گھپ تھا اور تانگے والا بھی محض اندازے سے تانگہ لے جا رہا تھا۔ اسٹیشن کے اندر پہنچے ہی تھے کہ سائرن بجنا شروع ہو گئے اور سب کو پناہ گاہ میں بیٹھنا پڑ گیا۔ اسی وقت طوفانی ہوا اور بارش شروع ہوگئی تو سائرن رک گئے۔ ہندوستانی طیارے طوفانی ہواؤں میں بمباری صحیح نہیں کر سکتے تھے۔ اسٹیشن سے ٹرین کا نکلنا بھی ایک مصیبت بن گئی۔ غالباً سب لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ ٹرین بھی نشانہ بن سکتی تھی۔ ہم رات کو ۱۰/ بجے گھر پہنچے۔

ہماری نظر میں جنگ عظیم کی یادیں ابھی تازہ تھیں۔ اس کے مقابلہ میں یہ جنگ چھوٹی سی تھی۔ کلّیہم ۲۲/ دنوں میں دونوں ملکوں کے سارے ہتھیار استعمال ہو گئے اور پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ جنگ بند کی جائے۔ اس وقت تک پاکستان کا زیادہ نقصان ہو چکا تھا، اور اس کے بہت سارے فوجی ہندوستان کی قید میں جا چکے تھے۔ جنرل ایوب خان نے تاشقند میں ہندوستانی وزیر اعظم شاستری کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کیا،

لیکن اس کے بعد وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ایوب خان میں کبھی نہ بنی۔

یہاں ہمیں ریڈیو پاکستان سے ایک مشاعرہ میں شرکت کی دعوت ملی۔ جنگ کے بعد لاہور میں یہ پہلا بڑا مشاعرہ تھا، اور شہر پر ابھی جنگ کے اثرات باقی تھے۔ رات کو بازار جلد ہی بند ہو جاتے تھے اور سواریاں بھی۔ لیکن ہم بھی شوق میں چلے ہی گئے۔ ہم اس مشاعرہ میں مہمان کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے اور یہاں ہم نے پہلی اور آخری مرتبہ مشہور شاعر مصطفیٰ زیدی کو دیکھا اور سنا.....

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

اب واپسی کے وقت ہم پتھروں اور کہکشاں کو بھول گئے۔ بس یہ تھا کہ کوئی سواری مل جائے۔ لیکن سواریاں نہ ملیں اور ہم سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے پیدل گھر پہنچے۔ اسی وجہ سے ہمیں یہ مشاعرہ اب تک یاد ہے۔

اسی طرح ایک سال گزرا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمارے جیٹھ اپنی دوسری بیٹی اور دو بچوں کے ساتھ لاہور آئے اور ہمارے گھر رُکے۔ بچوں نے بھی ان کے ساتھ جا کر پہلی مرتبہ صحیح معنوں میں لاہور دیکھا۔ صبح ہی صبح سائیکل کرایہ پر لیتے اور سب جگہیں دیکھ بھال کر شام تک گھر واپس آتے۔ جب ہمارے جیٹھ کشمیر واپس جانے لگے تو ہمیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دے گئے۔ یہ گجرات شہر کے قریب تحصیل بھمبر میں رہتے تھے۔ ہم نے بھی خوشی خوشی آنے کی دعوت قبول کر لی۔ صرف دو بڑے بچّوں کو لاہور میں شہنشاہ نواب کے گھر میں چھوڑنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ صاحب انارکلی میں بھیم گلی یا بھیم اسٹریٹ نمبر۲۱/، مکان نمبر۱۲/ میں رہتے تھے۔ ہمارے بڑے بیٹے پٹارو سے ایف ایس سی کا امتحان دے چکے تھے اور انہوں نے مغلپورہ میں واقع انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے درخواست بھی جمع کروادی تھی۔ ان کو یہاں آ کر اپنے داخلہ کا کام کرنا تھا۔ دوسرے بیٹے شمس نویں جماعت کا بورڈ کا امتحان دینے کے لئے رک گئے۔ اس طرح اب ہمارا صرف پانچ بچوں کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ تھا۔ شہنشاہ نواب کا مکان پانچ منزلہ تھا، اور اس میں صرف یہ اور ان کی والدہ رہتی تھیں جنہیں سب بھابھو کہتے تھے۔ بھابھو ہماری ساس کی دوپٹہ بدل بہن تھیں اور ان سے ہم پہلے بھی لکھنؤ میں مل چکے تھے۔ یہ سوچا تھا کہ بھمبر سے واپس آنے تک ذاکر صاحب نیا گھر لے چکے ہونگے کیونکہ سنت نگر والے گھر سے ہم اتنے خوش نہیں تھے۔

اٹھارواں سفر ۔ لاہور سے بھمبر، بسیں اور پنجاب کی گرمی

لاہور سے بھمبر جانا ہمارے لئے تو کوئی معرکہ نہیں تھا۔ ہم اس سے پہلے بھی بسوں میں بیٹھ چکے تھے، لیکن ایک شہر سے دوسرے شہر بسوں میں پہلے کبھی نہیں گئے تھے۔ بھمبر جانے کے لئے یہی ایک سواری تھی سو ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ بھمبر بس سے جایا جائے۔ ۱۹۶۶ء کی گرمیوں کا موسم تھا۔ ہم نے سارے بچوں کو اکٹھا کیا، اور ایک ٹیکسی لینے کی کوشش کی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ کوئی بھی ٹیکسی ہمیں اور پانچ بچوں کو بٹھانے پر تیار نہیں ہوتی تھی۔ مجبوراً تانگہ کرنا پڑا۔ سنت نگر سے بادامی باغ پر واقع بسوں کے اڈّہ، جنرل بس اسٹینڈ، پہنچنے کے لئے لاہور کے نامی گرامی علاقوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلے سینٹرل ماڈل اسکول، پھر حضرت داتا گنج، بھاٹی اور لوہاری دروازہ، اور اس طرح چلتے ہوئے بالآخر ہم بادامی باغ پہنچے۔ پہلے گجرات کی بس لی۔ بس میں بیٹھنے کے کوئی آدھے گھنٹے کے بعد بس کے چلنے کی باری آئی۔ اتنی دیر کے لئے ضروریات حوائجِ زندگی کو بھولنا انتہائی اہم تھا۔ پھر بس چلی تو آندھی طوفان کی طرح، تانگوں، سائیکلوں، اور سائیکل اور موٹر رکشاؤں سے لڑتی جھگڑتی راوی کا پرانا پل پار کر کے شاہدرے سے ہوتی ہوئی اور تیز ہوتی گئی۔ سارے راستے ڈرائیورز ورز ور سے سر ہلا کر ریڈیو پر بجتے ہوئے پنجابی گیتوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس وقت کیسیٹ ٹیپ ریکارڈر ایجاد تو ہو گئے تھے لیکن عام بسوں میں نہیں آئے تھے۔ بس ڈرائیور بسوں کے ہر اڈّے پر دو یا تین منٹ رکے، اور مسافروں کو باقاعدہ اس طرح اتارے جیسے کہ بوریوں کو پھینکا گیا ہو۔ دوسرے مسافر اوپر چڑھتے، اور کچھ صرف آدھے اوپر ہوتے اور آدھے لٹکے ہوتے کہ بس یہ جا وہ جا۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ کراچی میں نجی بسیں اتنی بری طرح کیوں چلتی تھیں۔ غرض ہم نے دریائے چناب کا پل پار کیا اور گجرات کا شہر نظر آنے لگا۔ جگہ جگہ چھوٹی بڑی

صنعتی عمارتیں نظر آنے لگے۔ گجرات کا بسوں کا اڈّہ بڑا تھا اور شکر تھا کہ اس بس کا یہ آخری اڈّہ تھا۔ ہم نے ایک قلی سے اپنا سامان اتروایا اور اسے بتایا کہ ہمیں بھمبر کی بس میں سامان لے جانا تھا۔ بھمبر کی بس برابر ہی کھڑی تھی، ایک منٹ بھی نہ لگا اور ہم بھمبر کی بس میں تھے۔ یہ بس پچھلی بس سے بھی اعلیٰ تھی۔ سیٹیں تو سب سالم تھیں، اور اندر اور باہر کا رنگ بھی، لیکن شیشے بری طرح ہلتے تھے، اور کھڑکی کے شیشے بند کرنے کی کوشش بیکار رہی تھی، کیونکہ تمام شیشے اپنے راستوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

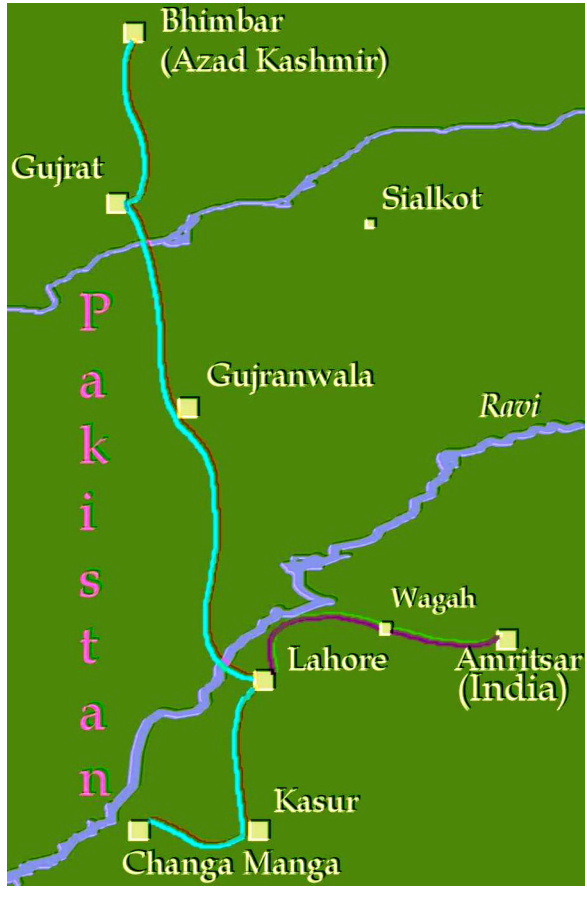

لاہور سے بھمبر، پنجاب کا زراعتی اور صنعتی گڑھ۔ نہروں سے آب پاشی.....دوسری طرف واہگہ، امرتسر اور چھانگا مانگا۔

اب بس چلی تو اندر پنجاب کی لُو نے نام پوچھ لیا۔ جیسے جیسے بھمبر قریب آتا گیا، گرمی بڑھتی رہی، اور ہمارے دل میں وادیٔ کشمیر کی خوبصورتی کا یقین مدہم ہوتا گیا۔ راستے ہی سے دور ہلکی نیلی پہاڑیاں دیکھ کر

خیال ہوا کہ شاید وہ علاقہ خوبصورت ہو۔لیکن جیسے جیسے قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ ساری ہی پہاڑیاں چٹیل ہیں اور ان پر درخت وغیرہ تقریباً ناپید تھے۔ ہر میل گزرنے پر اپنے بچوں کو داد دیتے رہے کہ وہ اس گرمی میں خاموشی سے بیٹھے تھے۔ بھمبر کے قریب پہنچے اور بھمبر نالہ پر آئے۔ یہ ایک برساتی نالہ ہے اور اس میں تھوڑا بہت پانی اس وقت بھی تھا۔عورتیں اس میں کپڑے دھو رہی تھیں۔ یہاں کاشتکاری ہوتی تھی۔اس وقت فصلیں کٹی نہیں تھیں لہذا ہر طرف سبزہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے قطعوں میں مختلف سبزیاں بوئی گئی تھیں اور کہیں بھٹّوں کی فصل لگی ہوئی تھی۔آس پاس کچے اور کچھ پکّے گھروں کی آبادی تھی۔اسی راستے میں ایک موڑ پر بس آہستہ ہوئی تو ایک جگہ کمہاروں کو برتن بناتے دیکھا۔عورتیں مٹی گوندھ رہی تھیں اور مرد تیزی سے برتن بنا کر ان کو آوے میں رکھ رہے تھے۔کہیں اینٹیں بن رہی تھیں۔ یہ علاقہ غالبًا دوسو یا دو ہزار سال پہلے بھی ایسا ہی لگتا ہوگا،لیکن بسوں کی جدّت نے یہ تاریخی تصویر کچھ بگاڑ دی تھی۔بھمبر کے بسوں کے اڈّے پر پہنچتے پہنچتے بس آدھی خالی ہو چکی تھی۔

ہم اُترے اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ایک صاحب سے تحصیل کے دفتر کا پتہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کے سامنے ہی کھڑے تھے۔اندر جا کر اپنے جیٹھ کے بارے میں پتہ کیا۔ دو منٹ میں ان کے سارے لڑکے وہاں موجود تھے اور یہ ہمیں اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر پہنچ گئے۔ دو منزلہ گھر تھا،ایک پتلی سی گلی میں،اور اس میں کوئی دس کمرے تھے۔ نیچے کی منزل کے کمروں میں اندھیرا بہت تھا،جو کہ گرمیوں میں اچھا لگتا تھا،لیکن سب اوپر کی منزل پر ہی رہتے تھے۔ ہمارے جیٹھ حبیب حسن صبح ہی صبح آفس جاتے اور ۱۱ر بجے واپس آجاتے تھے۔ ان کے ذمّے فصلوں کی بیماریوں سے بچاؤ،مصنوعی کھاد کا صحیح استعمال،اور پانی کے بٹوارے کا حساب تھا۔ پورا علاقہ زراعتی تھا،اس لئے تمام لوگ انہیں جانتے تھے۔

کئی دن گزر گئے اور کوئی ہم سے نہ کہے کہ چلو کہیں چلتے ہیں۔ ہم اشارۃً ان سب سے پوچھتے ''یہاں کیا ہے دیکھنے کو؟''،تو وہ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے کہ گویا یہ سوال ہی نہیں بلکہ جواب بھی تھا۔ آخر ایک دن ہمارے جیٹھ بچوں سے کہنے لگے،''اگر پکچر دیکھنا ہے تو شام کو تیار رہنا''۔ تیار کیا ہونا تھا،سب خوشی خوشی نہائے اور صاف کپڑے پہنے جو پانچ منٹ میں پھر پسینے سے شرابور ہو گئے۔ ۷ر بجے تک سب سے کہا گیا کہ ایک ایک کرسی اٹھائیں اور چلیں۔خواتین کی کرسیاں بڑے لڑکوں نے اٹھائیں۔کوئی ایک میل چلے تھے کہ ایک فٹ بال کا میدان آیا،اور اسے پار کیا تو ایک جگہ فوج کے جوانوں نے زمین کا ایک ٹکڑا دائرے کی شکل

میں کاٹ کر ہموار کر دیا تھا۔ سامنے ایک بڑی سی چادر تنی تھی جو ہلکی ہوا میں تنی ہوئی کھڑی تھی۔ کبھی ہوا تیز ہوتی تو یہ چادر ہلکے سے ہل جاتی تھی۔ سب لوگ اس جگہ اپنی کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے کہ اندھیرا ہو تو فلم چلے۔ لوگ اپنے ساتھ حقّہ اور چلم لائے تھے، کچھ کنگ اسٹارک اور کے ٹو سگریٹوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہر طرف تمباکو کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ تمام سپاہی ایک قطار میں سب سے آگے آلتی پالتی مارے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف فوجی افسران کرسیوں پر رونق افروز تھے، تو دوسری طرف شہری حکومت کے افسران کرسیوں پر نشستہ تھے۔ باقی لوگ آس پاس کھڑے تھے۔ اندھیرا ہوا اور فلم چلی۔ لوگوں نے ہلکے سے تعریف کی ندیم صاحب کی جو اس فلم کے ہیرو تھے، اور فلم کا نام تھا ''چھوٹی سی دنیا''۔ جہاں ہوا زور کی چلے، ندیم صاحب اور دوسرے اداکار اور اداکارائیں لہرانے لگیں۔ ہم نے سوچا کہ یہ تو پھنس گئے کیونکہ اس سے تو کوہاٹ کا سنیما ہی بہتر تھا جہاں ہم نے تقریباً ۱۸؍سال پہلے دلیپ کمار کی پہلی فلم جوار بھاٹا دیکھی تھی۔ کچھ بھوک نے بھی ستانا شروع کیا کیونکہ ہمیں اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو گود میں لے کر کافی دور چلنا پڑا تھا۔ ابھی ندیم صاحب ہیروئن سے متعارف ہی ہوئے تھے کہ ہم سب کے لئے چائے اور زیرے کے لسکٹ آ گئے۔ نمعلوم کون مخلص تھا، لیکن یقیناً کسی زمیندار نے ہمارے جیٹھ کی مہمان نوازی کی تھی۔ رات ۱۲؍بجے فلم ختم ہوئی۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بھمبر تحصیل کی آمدنی کہاں سے ہوتی ہوگی۔ یہاں ایک برائے نام کلینک تھا، اور ایک ہسپتال جسے ہسپتال کہنا جرم ہونا چاہئے تھا۔ پیداوار میں تازہ دودھ اور دہی، یا آم، بس یہ ہی چیزیں کھانے کی تھیں، اور ہاں ان آم کے درختوں پر شہد کی مکھیوں کے چھتے بہت بڑے ہوتے تھے جس کی وجہ سے شہد بھی مل جاتا تھا۔ کوئی دوسرے پھل بھی زیادہ پیدا نہیں ہوتے تھے۔ سیاحت کا یہاں ذِکر ہی الفاظ کا نقصان تھا۔ پھر بھی ایک دن ہم نے زبردستی سب کے ساتھ ندی کے کنارے چل کر سارا علاقہ دیکھا۔ ندی کیا تھی، سوکھا ہوا نالہ تھا۔ سارا علاقہ ہی سوکھا پڑا تھا۔ کوئی ایسا نشان نہیں تھا کہ کہیں ندی ہو۔ سنتے تھے کہ ''پتن'' یہ نالہ برسات میں ندی بن جاتا ہے۔ کچھ اوپر پہاڑی پر بھی گئے۔ اوپر سے دیکھا تو لگا کہ یہ علاقہ ایک کٹورے کی طرح زمین پر رکھا ہوا تھا۔ گرمی تو اس مرتبہ لاہور میں بھی تھی لیکن بھمبر سرسبز اور کھلا ہوا تھا۔ دن میں کڑاکے کی گرمی، اور رات کو ٹھنڈ ہوتی۔ اسی میں دو ماہ گزر گئے، اور یہاں برسات شروع ہوگئی۔ جب بارشیں ہوتی تھیں تو ہوا تیزی سے اس پہاڑیوں کے گھراؤ میں اندر آتی اور پھر اس کٹورے کے اندر ہی اندر گھومنے لگتی تھی۔ ایک زبردست شور ہوتا اور پانی کی بوندیں بہت تیزی سے گھومتی ہوئی منہ پر لگتی تھیں۔ اگلے تین چار روز تک بارش

ایسی ہوئی کہ جیسے آسمان سے گولیاں برس رہی ہوں۔ ہر طرف بجلی کی گرج اور چمک، دن میں دو یا تین مرتبہ کہیں بجلی کے گرنے کی آواز، اور خونخوار ہوائیں۔ ایک دن بارش رُکی تو ہم نے واپس جانے کا بندوبست کیا۔ ہمارے بڑے صاحبزادے کیڈٹ کالج پٹارو سے واپس آنے والے تھے اور گھر کی چابیاں ہمارے پاس تھیں۔ ہمارے لاہور جانے کے اس منصوبے کی سب نے مخالفت کی کہ ان بارشوں میں اُس پتن نالے سے گزرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہم بھی مُصِر رہے تو ہمارے جیٹھ نے اپنے گھریلو ملازم سے کہا کہ وہ ہمیں ساتھ لے جا کر ندی کے پار بس اسٹاپ تک پہنچا دے۔ یہ بس اسٹینڈ جو عام دنوں میں بھمبر تحصیل کے دفتر کے سامنے ہوتا تھا، بارشوں کے دنوں نالہ کے دوسرے پار چلا جاتا تھا۔ تیاری مکمل ہوئی، اور ہم ایک جیپ میں اپنا سامان ڈال کر روانہ ہوئے۔ یہاں کی ملازمہ نے ہمارے لئے بسکٹ، چائے، اور کھانے پینے کی چیزیں ساتھ کر دیں تھیں۔ ہمارے جیٹھ ایک اور جیپ میں بیٹھ کر ہمیں بس میں سوار کرنے کے لئے ساتھ چلے۔ اب جیپ میں بیٹھے ہوئے پانی کے ایک چھوٹے سے قطعے کو عبور کیا تو پانی جیپ کے اندر تک آ کر ہمیں گیلا کرتا ہوا گیا۔ ایسا لگا کہ نوگاواں جاتے ہوئے بیل گاڑی پر سوار ہوں۔ اب یہ جیپ یہاں سے آگے نہیں جا سکتی تھی کیونکہ پانی آگے گہرا تھا۔ بسیں ندی کے اُس پار تھیں، اور ندی کا پانی بہت ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ آس پاس دوسرے لوگ بھی تھے، اور ساتھ ہی ایک بارات بھی ندی پار کر رہی تھی۔ یہ بارات دلہن کو بھمبر سے لے کر واپس جا رہی تھی، اور دلہن بھی ساتھ تھی۔ ہم نے دلہن کو دیکھا کہ اس نے اپنا گھونگھٹ والا دوپٹہ کھول کر سر پر باندھا، دھوتی جیسا پاجامہ اوپر لا کر کمر میں اڑس لیا، اور سر پر اپنے جہیز کا صندوق رکھا، ہاتھوں میں اپنی پیڑھی پکڑی، اور غڑپ غڑپ کر کے دیکھتے ہی دیکھتے ندی پار کر گئی۔ اس سے ہماری بھی ہمت بندھی۔ ہم نے سب سے چھوٹی بچی کو تو ملازم کے حوالے کیا اور خود اپنے چپل ہاتھ میں لئے، کھانے کی باسکٹ پکڑی اور اپنی دو بچیوں کے ہاتھ پکڑ کر لگے ندی پار کرنے۔ ہر قدم پر پانی آدھا فٹ اوپر آئے۔ شور مچا ہوا تھا کہ ندی جلدی پار کرو، اوپر پہاڑوں سے پانی آنے والا ہے۔ پانی اتنا تیز تھا کہ ہمارے ہاتھ سے ساری چیزیں گر گئیں اور بچیوں کے ہاتھ بھی چھوٹ گئے۔ پانی بچیوں کے گلے تک تھا اور تیز تھا۔ ہم نے فوراً شور مچا دیا بچیوں کو بچانے کے لئے۔ اپنے ساتھ والے سب آگے نکل گئے تھے اور پانی کے شور میں اُن کے پاس آواز نہیں جا رہی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو دو مرد بڑے بڑے پگڑ باندھے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دیتے ہوئے ہماری طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ یہ قریب آئے اور انہوں نے دونوں بچیوں کے ہاتھ پکڑ کر انہیں پانی سے باہر کھینچا۔ انہیں گود میں لے کر کہنے لگے، ''خیر ہوگئی بھین

جی، ادھر کدروں توں چل پئی۔ ایدرے تو وڈہ خطریا اے (خیر ہوگئی بہن جی، تم ادھر کیوں آ گئیں، یہاں تو بہت خطرہ ہے)''۔ پھر ان لوگوں نے لمبے لمبے ڈگ بھر کے ہمیں ندی پار کروادی۔ اب ہم سب نے ایک دوسروں کو دیکھا تو سب ہی مٹی اور پانی میں لت پت تھے۔ بس میں بیٹھے تو وہاں ایک ہنگامہ ہو رہا تھا۔ سیٹوں پر بچے براجمان تھے اور سارے براتی کھڑے شور کر رہے تھے کہ ''اوساڈی تو ساری بس ای بک اے تے اساں کیوں کھلوندے روئیں (ہم نے تو ساری بس بک کی تھی تو ہم کیوں کھڑے رہیں)؟''۔ ہم نے ایک سے کہا کہ ''بھیا، بچوں کو گود میں لے لو اور تم بھی بیٹھ جاؤ''۔ یہ بات اُن کی سمجھ میں آئی، سب بیٹھے اور بس چلی، اور ہم یہ مشورہ دینے پر ایک عام ''بی بی'' سے ان کی ''باجی'' بن گئے۔ سارے راستے بارشوں کی تباہی نظر آئی۔ کچے مکان بارش میں ٹوٹ گئے تھے۔ لاہور تک یہی حال تھا۔ چناب اور راوی بھی چڑھے ہوئے تھے۔ جب ہم سنت نگر پہنچے تو دیوسماج روڈ پر بھی پانی گھوڑے کے پیروں تک تھا، اور گھوڑوں کی گندگی ہر طرف ایسے تیر رہی تھی جیسے ندیا میں بے ماجھی ناؤ۔

یہاں بچے تالہ وغیرہ توڑ کر گھر میں آ گئے تھے۔ نجم کا انجینیرنگ یونیورسٹی میں داخلہ ہو چکا تھا اور شمس کا نویں کا نتیجہ بھی آ چکا تھا جو بہت اچھا تھا۔ لاہور گرمی کے معاملے میں کسی اور شہر سے کم نہیں، لیکن ہماری لاہور واپسی تک شہنشاہ نواب اور اُن کا خاندان سنت نگر میں اپنے نئے گھر میں منتقل ہو چکے تھے۔ اور ان کا انارکلی کا گھر خالی تھا۔ ہمارے لئے انارکلی کا گھر زیادہ مناسب تھا۔ یہاں سے مغلپورہ کی بسوں کا انتظام بھی اچھا تھا اور بچوں کے اسکول بھی قریب تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے ہم انارکلی کے اس گھر میں منتقل ہو گئے۔ گھر بہت قدیم تھا، تقسیم سے بھی دسیوں سال پہلے کا۔ لیکن پرانے زمانے کی کارکردگی اور مضبوطی عیاں تھی۔ گرمیوں میں ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم۔ اینٹوں کی دیواریں ڈیڑھ فٹ چوڑی تھیں۔ اس گھر میں بس ایک مشکل یہ تھی کہ رہائش تو دوسری منزل پر تھی اور حوائجِ ضروری کا انتظام پانچویں منزل پر تھا۔ ہندوستان کی تقسیم سے پہلے یہ ہندوؤں کا محلّہ تھا۔ ہماری مہترانی جو خود کچھ ہندو اور کچھ عیسائی تھی، بتاتی تھی کہ تقسیم کے وقت کتنے ہی ہندو اس کی آنکھوں کے سامنے اسی بھیم گلی میں باقاعدہ ذبح کیئے گئے تھے۔

جب ہنگاموں کی بنیاد مذہب ہو تو ہنگامے صرف ہندو اور مسلمانوں تک ہی کیوں محدود ہوں۔ لاہور میں ہم محرم کی مجلسوں کے لئے کرشنا نگر جاتے تھے۔ محرموں کے ایسے ہی ایک دن ہم اپنے ایک جاننے

والی صاحبہ کے ساتھ لال حویلی گئے۔ یہاں پتلی پتلی گلیاں ہیں جو پرانے لاہور کا خاصہ ہیں۔ ہم نے شام کو واپس آتے ہوئے دیکھا کہ کچھ لوگ ذوالجناح گھوڑے کو گھبرائے ہوئے لئے آرہے تھے اور اسی طرح قریب کے ایک مکان میں داخل ہو گئے۔ اب ہمیں تشویش ہوئی اور ہم نے کچھ اور لڑکوں سے اس کے بارے میں پوچھا۔ یہ لڑکے لباس سے شیعہ لگتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آگے شیعہ سنی ہنگامہ ہو رہا تھا اور جانا خطرناک تھا۔ اب ہم رکتے کہاں، یہ علاقہ بالکل اجنبی تھا۔ ایک عمارت کے دروازے کو کھٹکھٹایا، کسی نے کھولا نہیں تو ہم نے دروازے کو دھکا دیا۔ یہ کھلا ہوا تھا۔ ہم نے اندر قدم رکھا تو اندھیرا سا تھا۔ اس گھر کی چھتیں نہیں تھیں، صرف دیواریں، ملبہ، کوڑا، اور بلّیاں تھیں۔ ہم کافی دیر یہاں چھپے بیٹھے رہے، مگر کب تک رُکتے۔ دعائیں پڑھتے ہوئے باہر آئے اور اندر گلیوں سے گھومتے ہوئے ملتان روڈ پر پہنچے۔ ایک دو حضرات سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ملتان روڈ سے انارکلی کا راستہ محفوظ تھا لیکن کرشنا نگر میں زبردست ہنگامہ بپا تھا۔ ہمت کر کے پیدل ہی انارکلی کے نیلا گنبد والے گھر میں پہنچے۔ اسی طرح ہنگامے کراچی میں بھی ہوتے تھے، لیکن وہاں یہ بہت کم ہوتے تھے۔

لاہور سے چھانگا مانگا

ہمیں نیلا گنبد کے قریب اس گھر میں بسنے میں کوئی وقت نہ لگا۔ اتنی ہجرتیں کر چکے تھے کہ اب ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقلی تو آنکھیں بند کا کھیل تھا۔ سب بچے اسکول جانے لگے۔ گرمی ذرا سی کم ہوئی تو ذاکر صاحب کے دفتر والوں نے چھانگا مانگا جانے کا منصوبہ بنایا۔ چھانگا مانگا لاہور سے قریباً ۴۵ میل کے فاصلہ پر واقع ایک جنگل ہے جو رقبہ میں ۱۲،۰۰۰ ایکڑ کے لگ بھگ ہے اور اس میں اُس وقت پتلی پٹری کی کوئلے کے انجن والی ریل گاڑی چلتی تھی۔

دوسروں کی طرح ذاکر صاحب کے لئے کھانا گھر سے پک کر جاتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے کراچی میں ہوتا تھا۔ ایک صاحب گھر سے کھانا لے کر سائیکل پر برانڈرتھ روڈ پہنچا دیتے۔ ہم نے ایک دو بار ذاکر صاحب کے ساتھ ساتھ اُن کے دفتر والوں کے لئے بھی چنے کی دال بھرے بَرہئی پراٹھے اور کشمیری مرچ والا قیمہ بھیجا تھا اور یہ ان لوگوں کو بہت پسند آیا تھا۔ اس پکنک پر بھی ہم سے انہی چیزوں کی فرمائش کی گئی۔ ہم اس کے ساتھ قوامی سویّاں اور شامی کباب اپنی طرف سے لے گئے۔ منصوبہ یہ تھا کہ سب شرکاء فلیٹیز ہوٹل پر جمع ہو جائیں گے اور وہاں ایک ٹورسٹ بس میں بیٹھ کر چھانگا مانگا جائینگے۔ ہم صبح کو پہنچے تو وہاں ایک مجمع سا لگا تھا۔

بس وقت پر آئی، سب ہی لوگ وقت پر آ گئے تھے۔ سارے راستے ہر طرح کے موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ ہم نے غلطی یہ کی کہ ساڑھی باندھی تھی اور اونچی ہیل کے سینڈل پہنے تھے۔ سارے راستے ہماری ساڑھی کی تعریف ہوتی رہی۔ چھانگا مانگا پہنچے تو اُس کے جنگلات دور سے ہی نظر آنے لگے۔ بسیں باہر دروازے ہی پر رک گئیں اور ہم ریسٹ ہاؤس سے ہوتے ہوئے آس پاس نظریں دوڑاتے رہے۔ بس درخت تھے اور دور ایک بڑی سی جھیل نظر آ رہی تھی۔ یہاں سب نے طے یہ کیا کہ کھانا پہلے ہو جائے تا کہ کچھ وزن ہلکا ہو جائے۔ لیجیئے! کھانا کھانے میں اور ایک دوسرے کے کھانے کی تعریفوں میں دو گھنٹے گزر گئے۔ اس کے بعد بچوں کو لے کر چلنے میں بڑی تکلیف۔ کسی کا جوتا گر رہا ہے تو کسی کی ٹوپی، کسی کو ٹافی چاہیئے تو کوئی سونا چاہتا تھا۔

اسی طرح سب کو لے کر ہم لوگ اِس چھوٹی سی کھلونہ نما ریل گاڑی پر گئے۔ پورے جنگل کا ایک چکر لگایا۔ جنگلات گھنے تھے اور درخت اونچے اونچے تھے۔ ہر درخت پر نمبر لگے تھے۔ ۱۲،۰۰۰/ ایکڑ کا یہ جنگل کافی توجہ مانگتا ہوا لگ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ یہاں درخت کاٹے جا رہے تھے۔ ویسے تو یہ جنگل انگریزوں نے ریلوے انجن میں لکڑی استعمال کرنے کے لئے لگائے تھے، لیکن اب اس طرح کے انجنوں کا استعمال کم ہو رہا تھا اور یہ لکڑی کہیں اور جا رہی تھی۔ اسی طرح مری جاتے ہوئے بھی درخت ہمیں ہر سفر پر پچھلے سفر سے کم نظر آئے، اور کئی سال بعد ہم جب کراچی آئے تو ہمارے گھر کے باہر کے درختوں اور پودوں کو تو چرواہے اپنی بکریوں کو کھلا دیتے تھے۔ رہ کو تو لڑنے مرنے کو تیار۔

اس ٹرالی یا اس ریل گاڑی میں ہم سوچتے رہے کہ یہ درخت نہ معلوم کس نے لگائے، کون اس کے سائے میں آیا، اور کون ان کو کاٹ کر اس کی لکڑی بیچ دے گا۔ یہی دیکھتے اور سوچتے ہمارا سفر ختم ہوا، ہم نیچے اترے اور پل کی طرف چلے۔ یہ رسّیوں کا پل تھا جو ڈوریوں سے ٹنگا ہوا تھا۔ نیچے پانی تھا۔ تھوڑا خوف تو آیا، لیکن سب ہی جا رہے تھے، ہم بھی گئے۔ ہماری پتلی ہیل کا جوتا ہر قدم پر زمین میں دھنس جاتا تھا جس کی وجہ سے ہم اپنے سینڈل سارا وقت ہاتھ میں سنبھالے رہے۔ اسی طرح شام ہوئی۔ سب نے معمول سے زیادہ ہی چلنا پھرنا کر لیا تھا، لہذا بچوں اور بڑوں کی حالت صحیح نہیں تھی۔ واپسی میں لوگ آپس میں باتیں کم کر رہے تھے اور ڈرائیور کو تیز تیز چلنے کی ہدایات زیادہ دے رہے تھے۔

لاہور کی انارکلی کی رونق دوسروں کے لئے ایک تفریح تھی، لیکن ہمارے گھر کا پچھواڑہ اور دردِ سر

تھی۔لوگ دور دور سے ہمارے گھر آتے، سانس لینے اور چائے پینے کے لئے۔ پھر اپنا بھاری سامان ہمارے ہاں چھوڑ کر انارکلی کی تفریح کے لئے نکل جاتے۔ واپسی پر ہمیں ان کی خریدی ہوئی چیزیں دیکھ کر نہ صرف ان کی پسند کی تعریف کرنا پڑتی، بلکہ یہ بھی کہنا پڑتا کہ ''ارے واہ یہ آپ نے اتنے اچھے دام کیسے لے لی، یقیناً دکاندار کو مات کر دیا''۔ گھر سے پچھلی گلی میں ایک مشہور فروٹ چاٹ کی دُکان تھی جہاں چھولے اور پانی بھرے بتاسے خریدنے کے لئے لوگ دس سے پندرہ منٹ اپنی باری کے انتظار میں کھڑے رہتے تھے۔ انارکلی کی دوسری دُکانوں کی طرح وہاں بھی بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہمارے مہمان ہمارے گھر بیٹھ جاتے اور ہمارے بچوں کو بھیج کر وہاں سے چاٹ منگا لیتے۔ انہی وجوہات سے ہمارا گھر کافی مقبول رہا۔

وقت تیزی سے گزرتا ہے۔ یہ ۱۹۶۲ء کا ذکر ہے۔ ایک رات ہم نے خواب میں دیکھا کہ ہماری والدہ ایک میدان میں سے ہمارے قریب سے گزریں اور ہماری طرف دیکھا بھی نہیں۔ دوسرے دن ہم ایک محفل میں شرکت کر کے گھر پہنچے اور اپنے بھانجے سبطِ محمد کو اس خواب کے بارے میں بتایا۔ اس پر انہوں نے بتایا کہ آفس میں رامپور سے ٹیلیگرام تو ایک دن پہلے سے آیا ہوا تھا، لیکن ان کی ہمّت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ یہ ہمیں دیتے۔ ہماری والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اِس قدر مجبوری اور لاچاری کا احساس ہوا۔ بذریعہ ٹرین رامپور صرف ۱۳ر گھنٹے دور تھا لیکن ان جھگڑوں سے سارے راستے بند تھے اور ہم کسی صورت ہندوستان نہیں جا سکتے تھے۔ بس خود ہی رو دھو کہ چپ ہو رہے۔ عزیز اقرباء آئے اور تسلیاں دیں۔ خود ہی فاتحہ دی، قرآن خوانی ہوئی، مجلس بھی، سوگ منایا، اور سوگ بڑھا بھی دیا۔ صبر تو آجاتا ہے لیکن صورت برسوں نہ بھلائے جاتی ہے۔ یہ غم تو ہر ایک پر آتے ہیں، اور ہمارے بچوں پر بھی آئینگے۔ ایک نظم اپنی ماں پر لکھی اور اس طرح اِس ہستی کو فانی دنیا کا حصہ قرار دیکر خاموش ہو گئے۔

کچھ دنوں بعد ہمارے بیٹے شمس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ جاننے والے مٹھائیوں کے ڈبّے لائے اور مبارکیاں دیں۔ انہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ ملا تھا، وہی کالج جہاں ان کے دادا پڑھ چکے تھے۔ اس سے ذہن کچھ ہلکا ہوا، پھر بچوں کے اسکول کالج شروع ہو گئے اور اس طرح زندگی کی مصروفیات اپنی جگہ آ گئیں۔

انیسواں سفر ۔ لاہور سے بھمبر، موٹر سائیکل کی سواری

۱۹۶۷ء ختم ہونے کو تھا، اور موسم ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔ اسی دوران ہمارے بھانجے سبطِ محمد لاہور آئے۔ وہ اپنی بیگم اور بچوں سے ملنے بھمبر جا رہے تھے۔ ان کی بیگم ہمارے جیٹھ کی بیٹی اور ان صاحبزادے کی ماموں زاد بہن تھیں۔ موٹر سائیکل پر جا رہے تھے، ہم سے بھی کہنے لگے کہ ''صرف ایک دن کا جانا آنا ہے، چلیں ساتھ''۔ ذاکر صاحب بھی کہنے لگے کہ ''ہاں چلی جاؤ، کچھ گھر کے باہر کی ہوا لگے گی''۔ ہمیں موٹر سائیکل کی سواری کا اعتبار نہیں تھا۔ لیکن سب لوگوں کے اصرار پر ہم جانے کو تیار ہو گئے۔ صبح فجر سے پہلے ہی نکل کھڑے ہوئے۔ پھر وہی راستہ، لیکن ابھی تانگے کم تھے۔ شاہدرہ تک پہنچتے پہنچتے سردی بڑھ گئی تھی اور ہم بھی اور سبطِ محمد بھی، دونوں سرد ہوا سے بچنے کے لئے آنکھیں نصف کھولے بیٹھے تھے اور ان میں بھی پانی بھرا ہوا تھا، اور اسی وجہ سے یہ صاحب موٹر سائیکل بہت دھیان سے اور سڑک کے بالکل کنارے پر مناسب رفتار سے جا رہے تھے۔ اتنے میں سامنے سے ایک ٹرک آیا، اپنی سامنے کی روشنی اونچی کیئے ہوئے اور پوری سڑک پر لہراتا ہوا۔ سبطِ محمد نے حاضر دماغی سے کام لیا اور موٹر سائیکل بچانے کے لئے سڑک سے اتاری تو ساتھ پڑی ہوئی بجری پر گئی۔ بجری پہیوں کے نیچے پھسلی تو موٹر سائیکل بھی پھسلی اور الٹ گئی۔ وہاں ہم دونوں تو الگ گرے، اور موٹر سائیکل ہم دونوں کو رگڑتی ہوئی بیچ سڑک پر۔ ٹرک والا شاید ایسے تین حادثے ہر روز ناشتہ سے قبل ہی کرتا تھا، اس لئے اسے پرواہ بھی نہ ہوئی۔ وہ آرام سے موٹر سائیکل سے بچتا ہوا تیزی سے یہ جا وہ جا۔ یہ بھی خیال نہیں کہ دیکھ لے کہ آیا ہم لوگوں کو طبّی مدد کی ضرورت ہے یا نہیں۔ لیکن خدا کو ہماری حفاظت منظور تھی۔ ہماری کہنیاں اور گھٹنے چھل گئے تھے۔ لیکن سبطِ محمد کے مطابق وہ ٹھیک تھے۔ موٹر سائیکل کو ٹھوک بجا کر دیکھا تو وہ بھی ٹھیک ہی

تھی۔ انجن کام کر رہا تھا اور پہیے بھی۔ ہم نے کہا کہ اب واپس چلنا چاہئے، لیکن وہ نہ مانے۔ دوبارہ سڑک پر آئے۔ وزیرآباد پر چناب پار کرنے سے پہلے جی ٹی روڈ کے کنارے ایک جھگّی ہوٹل سے گرم گرم چائے پی تو سردی کم ہوئی، گو ہاتھ پیروں میں ابھی بھی کپکپی تھی۔ گھر سے صرف ایک شال لپیٹ کر نکل پڑے تھے۔ اب سورج نکلا تو دیکھا کہ سبطِ محمد کے اچھی بھلی چوٹیں لگی تھیں۔ یہاں سے چلے تو بھمبر پہنچ کر موٹر سائیکل روکی۔ سب نے چوٹیں دیکھیں تو خوش آمدید کہنا بھول گئے اور صاحبزادے پر غصہ اتارنے لگے۔ پہلے اُن کے سسر، پھر ساس نے اپنی باری لی اور خوب غصّہ ہوئے۔ پھر اُن کی بیگم اُنہیں ایک کمرے میں لے گئیں اور باہر تک فضیحتوں کی آوازیں آتی رہیں۔ باہر ان کے بچے اپنی باری کا انتظار کرتے رہے۔ اب یہ صاحبزادے اپنی بیگم اور بچوں سے تو کیا ملتے، سارا وقت انہی باتوں اور پھر مرہم پٹّیوں میں گزر گیا۔ اسی میں شام کے ۳ بج گئے اور ہم نے واپسی کی تیاری کی۔

بھمبر آتے ہوئے ہم موٹر سائیکل کی رفتار کم کرواتے رہے تھے، لیکن واپسی میں اندھیرے کے ڈر سے ہم ان سے کہتے رہے کہ تیز چلیں۔ سردیوں کے دن بھی چھوٹے تھے۔ وزیرآباد چھوڑا تو اندھیرا ہو چکا تھا اور سنسان علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ ہم نے سبطِ محمد سے کہا کہ ''جتنا تیز چلا سکتے ہو چلاؤ''۔ انہیں بھی صرف شہہ ملنے کی دیر تھی۔ رات ۸ بجے تک شاہدرہ پہنچے، ذرا دم لیا اور ایک جگہ بیٹھ کر چائے پی۔ اب شہری علاقہ تھا اور جنگل کی لمبی سڑک ختم ہوئی تو ہم نے شہہ روکی اور کہا کہ اب موٹر سائیکل آہستہ چلائیں۔ گھر پہنچے تو یہاں بھی سب نے قرینہ سے اپنی اپنی باری آنے پر غصہ کیا۔ صاحبزادے نے ڈاکٹر کو دکھایا تو پتہ چلا کہ چوٹیں کافی گہری تھیں، اور کئی دن کے لئے بستر پر لیٹے رہنے کی ہدایت ملی۔

بیسواں سفر ۔ لاہور سے کراچی واپسی

سیاسی گہما گہمی

وقت کے ساتھ ساتھ فیشن پھر بدل گیا تھا۔ٹیڈی پتلونوں اور شلواروں کے الماریوں میں ڈھیر لگ گئے تھے کہ پی آئی اے نے اپنی ایئر ہوسٹسوں کا لباس ایک فرانسیسی فیشن کے گُرو کے کہنے پر بالکل سیدھے پاجامہ والا کرلیا۔اب یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پہلے یورپ میں سیدھی پتلونیں آئیں اور پھر پی آئی اے نے اپنایا، یا پی آئی اے نے شروعات کیں اور یورپ نے اپنایا،لیکن کہتے یہی ہیں کہ سیدھے پائنچے کا فیشن اتنا مقبول ہوا کہ یورپ میں عورتیں اس طرح کی پتلونیں بھی پہننے لگیں۔ پھر یہ بیل باٹم میں تبدیل ہوا تو ہمارے صاحبزادوں نے بھی بیل باٹم پتلونیں سلوائیں اور ایک نے تو سر کے بال کندھوں تک کر لئے۔شمپو کا خرچہ تگنا یا چوگنا ہو گیا۔ ہماری لڑکیوں کی شلواریں جو پہلے ڈیڑھ گز کپڑے میں سل جاتی تھیں،اب ڈھائی اور تین گز میں سلنے لگیں۔ہم سمجھتے تھے کہ لکھنؤ کے غرارہ اور شرارے بہت کپڑا ضائع کرتے تھے،لیکن ان شلواروں نے ان کو دوبارہ یاد دلا دیا۔جس طرح فیشن بدلتے تھے، اسی طرح ہماری زندگی کے رخ مڑتے تھے۔ جب ٹیڈی فیشن چلا تو ہمیں کراچی سے لاہور ہجرت کرنا پڑی۔اب فیشن بدلا اور بیل باٹم پائنچے شروع ہوئے تو ہمیں واپس کراچی جانا پڑا۔ہم ان ہجرتوں کو اس طرح ہنس کر سہہ لیتے ہیں کہ.....ہجرتیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں.....مگر یہ بُھلائی نہیں جاسکتیں۔

اِس ہجرت کی داستان یہ تھی کہ ۱۹۶۸ء میں ذاکر صاحب ابھی بھی محمد امین محمد صدیق میں کام

کرتے تھے۔ یہ دو بھائیوں کی کمپنی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ دونوں بھائیوں کی تجارتی دلچسپیاں مختلف ہوگئیں اورانہوں نے کاروبار علیحدہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ہمارے شوہر کو اس وجہ سے کراچی واپس جانا پڑا۔ سارے بچے ابھی اسکولوں میں مصروف تھے۔ سب سے بڑے صاحبزادے انجینئرنگ یونیورسٹی میں کیمیکل انجینئرنگ کے تیسرے سال میں تھے، اور ہم بے چینی سے انتظار کرتے تھے کہ یہ ڈگری لیں تو ذاکر صاحب کا کچھ ہاتھ بٹے۔ دوسرے ابھی ایف ایس سی کے دوسرے سال میں پہنچے تھے۔ اِنہوں نے ایک صاحبزادے کو ٹیوشن پڑھانا شروع کردیا تھا۔ تیسرے صاحبزادے نے اسکول کی تعلیم کے ساتھ انارکلی میں اسٹینڈرڈ بک اسٹور میں پارٹ ٹائم کام شروع کردیا تھا۔ انہیں بچپن ہی سے تجارت کا شوق تھا۔ یہاں کا یہ کام ان کی تربیت میں کافی اثرانداز رہا۔

اسی اثناء میں جنرل ایوب خان نے اپنے دور کو دورِ ترقی کا نام دے کر اسے ''ترقی کی دہائی'' کا نام دیا۔ لیکن قوم تاشقند کے معاہدہ کے بعد ان سے ناخوش تھی، اور ذولفقار علی بھٹو اور مجیب الرحمٰن ان کے خلاف کھڑے ہو چکے تھے۔ سال کے آخر تک لاہور میں جنرل ایوب خان کے خلاف ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی۔ کچھ سچ اور کچھ جھوٹ خبریں اڑتیں۔ ایسے ہی ایک دن ہم سبزی خرید رہے تھے کہ ہماری پڑوسن تیز تیز چلتی ہوئی جاتی دکھائی دیں۔ ہم نے ان سے سلام علیک کرنا چاہی تو وہ معذرت کرکے پھر تقریباً بھاگنے لگیں۔ ہمیں تشویش ہوئی۔ اطراف میں پتہ کرنے پر خبر ہوئی کہ اسکولوں میں لڑکیوں کو نس بندی کے ٹیکے لگوائے جارہے تھے۔ ہم اور دوسری تمام مائیں بھاگ کر اسکول پہنچیں اور ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ ہر ایک اپنی بچی کو نکال کے لے جارہا تھا۔ ہم نے بھی اپنی بچیوں کو نکالا، اور ان سے پوچھ گچھ کی، ہر طرف سے ٹٹول کر دیکھا کہ کہیں انجکشن کا نشان تو نہ تھا۔ یہ بھی افواہ نکلی جس نے ہمیں بہت پریشان کیا تھا۔ پنجاب کے گورنر جنرل موسیٰ ہوئے، اور ہنگاموں میں اب آنسوؤں کی گیس اور گولیاں استعمال ہوئیں۔ ہمارا گھر پنجاب یونیورسٹی، گورنمنٹ کالج اور دوسرے اسکولوں کے قریب تھا لہذا سارا دن اسکول کے طالب علم گیس اور گولیوں سے بھاگ کر ہماری گلیوں میں آجاتے۔ انارکلی اور نیلے گنبد کے چوراہے سے آنسوؤں کی گیس سارا دن ہمارے گھر میں بھری رہتی تھی اور ہم پانی سے منہ دھوتے رہتے تھے۔ ساتھ ہی نعرے لگنے شروع ہوئے کہ ''روٹی، کپڑا اور مکان، مانگ رہا ہے ہر انسان''۔ تو اس میں نئی چیز کیا تھی۔ ازل سے ابد تک انسان یہی مانگے گا، اور یہ طے ہے کہ سب انسانوں کو برابر کا حصہ نہیں ملے گا کیونکہ اگر ایسا ہو تو دنیا میں کام رُک جائے گا۔ ہم اور ہمارے خاندان نے

ذوالفقار علی بھٹو کی طرفداری کی۔ ہنگامے پر ہنگامے ہوتے رہے، بیگار کیمپ بھی دریافت ہوئے اور بیگاری بھی۔ آج تک کوئی نہیں پکڑا گیا اور کسی کو سزا نہیں ہوئی۔ بس لڑائی بڑھتی گئی۔ ایک دن کچھ طالب علم پولیس سے بھاگ کر ہمارے گھر کی سیڑھیوں میں چھپ گئے تو پولیس ہمارے گھر میں بھی داخل ہوگئی۔ انہیں پکڑا اور بری طرح مارتی ہوئی لے گئی۔ اب ہم یہ باتیں یاد کرتے ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ اس زمانے کی پولیس پھر بھی بہت بہتر تھی۔ کراچی میں ۱۹۹۰ء کے بعد ہمارا پولیس سے بالکل اعتبار اٹھ گیا۔ گو کہ ضرور اس پولیس میں اچھے لوگ بھی ہونگے، لیکن کہا ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔

اِدھر جنرل ایوب کے خلاف ہنگامے بہت بڑھ گئے۔ لاہور میں جنرل موسیٰ گورنر تھے۔ روز آنہ مال روڈ پر گورنر ہاؤس کے سامنے ہنگامے ہوتے۔ حالات بہت خراب ہوئے تو سال کے آخر تک ایوب خان نے اقتدار جنرل یحییٰ خان کے حوالے کر دیا۔ مارشل لاء پھر لگ گیا تھا۔ لوگوں نے کچھ سکون کا سانس لیا۔

اسی زمانے میں ہم پہلی مرتبہ شالامار باغ گئے۔ ہمارے ساتھ شہنشاہ نواب کی بھابھی، کہ جن کا نام قمر جہاں بیگم تھا، ان کے بچے اور ہماری ایک دوست شمیم بیگم تھیں۔ سارا باغ دیکھتے رہے اور بارہ دری کے پاس ہم جا کر رُکے، اور چلے گئے انارکلی، نور جہاں، اور جہانگیر کے دور میں۔ ان کے واقعات ایک فلم کی طرح ہمارے ذہن میں چلنے لگے تھے۔ چشمِ تصوّر بھی، تخیلات بھی، اور جگہ بھی وہی، مگر بدلے حالات میں ان چیزوں کو دیکھا تو شالامار باغ اداس سا نظر آنے لگا۔ مگر ساتھی خوشدل تھے اور ایک نے یاد دلایا کہ ''باجی آجکل کے زمانے میں یہ کھانے کا وقت ہے، اپنے برہئی پراٹھے اور آم نکالیں''۔ سب نے کھانا کھایا اور دوبارہ اپنے زمانے کی دلچسپیوں میں محو ہو گئے۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا اور ۱۹۶۹ء میں ہمارے بیٹے قمر میٹرک کا امتحان پاس کر کے کراچی روانہ ہو گئے۔ ساتھ ہی چوتھے بیٹے اعزاز بھی روانہ کر دیئے گئے۔ خاندان اِدھر اُدھر ہو جائے تو زندگی بندھ سی جاتی ہے۔ ادھر شمس ایف ایس سی میں اچھے نتیجہ سے کامیاب ہو کر انجینئرنگ یونیورسٹی میں مکینکل انجینئرنگ کے لئے داخل ہو گئے تھے۔ چند ہی ماہ بعد کراچی سے ذاکر صاحب نے ہمیں پیغام بھیجا کہ ہم کراچی آنے کی تیاری کریں۔ یہ دو بڑے لڑکے اب سمجھداری کی عمر کے ہو گئے تھے، لہذا ہم نے ان دونوں بھائیوں کو انجینئرنگ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں ڈالا اور خود کراچی کی طرف روانگی کا انتظام کیا۔ ۱۹۷۰ء شروع ہو چکا تھا اور ابھی

سردیاں تھیں۔ ہمارا دِل ملول تھا۔ سارے پڑوسی اور ملنے والے، عزیز اور بچوں کے دوست اور سہیلیاں ہمیں الوداع کہنے کے لئے گھر آئے۔ سارے گھر کی گرہستی لوگوں میں ایسے بانٹی جیسے کہ اس بنٹائی کے ہم ماہر ہوں۔ جو باقی بچا وہ ایک تانگہ میں ڈالا اور اس طرح ہم چلے اسٹیشن کی طرف۔ گھوڑا اس سامان اور لوگوں کے وزن کی وجہ سے کچھ ہلکے ہلکے چل رہا تھا، لیکن پھر بھی ہم وقت پر اسٹیشن پہنچ گئے۔ سامان اتارا اور تانگے والے کو پیسے دینے لگے تو وہ بھی دوسروں کو خاموش اور رنجیدہ دیکھ کے رنجیدہ نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم نے پیسے دیئے تب وہ مسکرایا اور شکریہ ادا کیا۔ ہم نے تانگہ کو اچھی طرح نظر بھر کر دیکھا۔ کسی تانگہ پر یہ ہمارا آخری سفر تھا۔

ہمارے ساتھ شہنشاہ نواب کا ایک پرانا ملازم خلیل بھی آ گیا۔ اس کے والد ریلوے میں تھے اور اسے مفت ٹکٹ ملتے تھے۔ کہتا تھا کہ اگر اسے اپنے والد سے مفت ٹکٹ نہ بھی ملتا تو بھی وہ ہمیں کراچی تک چھوڑنے ضرور آتا۔ یہ ہمارے ساتھ کراچی تک آیا اور اس سے ہمیں بڑی آسانیاں ہوئیں۔ کراچی دوسرے دن شام کو پہنچے۔ گھر پہنچے، سبھی خوش تھے کہ اپنے ابو کے پاس آ گئے۔ یہاں سب کو پھر اسکول میں داخل کرانا تھا، لیکن ابھی گرمیوں کی چھٹیاں باقی تھیں سو ہم نے وقت کی کمی محسوس نہ کی۔ لیکن جب ہم نے داخلے کی کوششیں شروع کیں تو اندازہ ہوا کہ یہاں داخلے گرمیوں کے شروع میں ہو چکے تھے۔ اس لئے لڑکیوں کے اسکول میں داخلہ میں تھوڑی تکلیف ہوئی۔ پھر بھی ان دو بڑی لڑکیوں کو جیکب لائنز کے گورنمنٹ گرلز اسکول میں داخلہ مل گیا۔ اس کے بعد جو ہمارے پیروں میں زنجیر پڑی تو سارے سفر ختم۔ ہم جب کراچی پہنچے تو شروع میں عزیز آباد میں رہے۔ ہمارے یہاں پہنچنے کے کوئی پانچ ماہ بعد ہمارے بڑے صاحبزادے نے کیمیکل انجنیئرنگ میں بی ایس سی، بی ای کی سند لے لی۔ خفیف سی کوشش کے بعد انہیں جسٹس لاری کی سوڈا ایش فیکٹری میں اسسٹنٹ انجنیئرنگ منیجر کی ملازمت مل گئی۔ ہمارے بیٹے قمر جو سراج الدّولہ کالج میں طلباء کی یونین کے پہلے سیکریٹری اور پھر صدر منتخب ہوئے، اس وقت انٹرمیڈیٹ کامرس کے دوسرے سال میں تھے۔ ہم نے عزیز آباد چھوڑا اور انچولی سوسائٹی منتقل ہو گئے۔ کراچی میں یہ ہمارا چھٹا گھر تھا۔ اس گھر میں یہ بھلائی تھی کہ یہ واٹر پمپ سے قریب تھا لہذا یہاں تک واٹر پمپ اسٹیشن سے آنے والے پانی کا اتنا دباؤ ہوتا تھا کہ نلکوں میں پانی ابھی بھی آتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ پانی ٹینکر ٹرکوں کو جانے لگا تو گھروں میں پانی کا دباؤ بہت گر گیا اور گھر گھر لوگوں نے پانی کھینچنے والے پمپ لگانا شروع کر دیئے۔ مجبوراً ہم کو بھی یہ اخراجات اٹھانا پڑے۔

الیکشن ۱۹۷۰ء

جنرل یحییٰ خان ابھی بھی حکومت کر رہے تھے۔ انتظام یہ ہوا کہ ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بالغ ووٹوں کے حساب سے انتخاب دسمبر ۱۹۷۰ء میں ہوں۔ اس سے پہلے ملک میں قومی اسمبلی کے ممبر اپنی آراء سے وزیرِ اعظم چنتے تھے اور ان کو رشوت دے کر انتخابات کا پانسہ پلٹنا آسان تھا۔ لہذا اب پریشانی یہ تھی کہ ملک کا سارا نظام بنگالیوں کے پاس جاتا تو پنجاب کی ساکھ ختم ہو جاتی، اور ووٹ خریدنا اب مشکل تھا۔ مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ بہت مضبوط تھی اور اس بات میں کوئی شک ہی نہیں تھا کہ وہاں سے مغربی پاکستان کی جماعتیں نہیں جیت سکتی تھیں۔ دوسری طرف ذوالفقار علی بھٹو جو خود کو ایوب خان کی حکومت ختم کرنے کا واحد ذمہ دار سمجھتے تھے، اس بات کے لئے بالکل تیار نہ تھے کہ حکومت ان کے ہاتھ میں نہ ہو۔ انہوں نے ''روٹی کپڑا اور مکان، مانگ رہا ہے ہر انسان'' کا نعرہ لگایا جو صرف مغربی پاکستان میں مقبول رہا۔

ہماری ایک واقف کار انتخابات کے دوران رائے دہانی کے ایک خیمہ میں انتخابی افسر کی حیثیت سے تعینات تھیں۔ انہوں نے ہمیں دعوت دی، ''ہمارے ساتھ چل کے دیکھئے، الیکشن کیسے ہوتے ہیں''۔ ہم نے جواب دیا، ''معلوم نہیں آپ کہاں پھنسائیں گی''۔ وہ کہنے لگیں، ''ووٹ تو ڈالنا ہے نا، تو ذرا دیر ہمارے پولنگ بوتھ میں آ کر اور بھی دیکھئے گا''۔ اب شامتِ اعمال یا ہماری اندرونی جستجو کہ ہم ان کے رائے دہانی کے خیمے (پولنگ بوتھ) پہنچ گئے۔ انہوں نے ہمیں بڑے خلوص سے خوش آمدید کہا اور ہمیں ایک کرسی پر بٹھا کر خود نہ جانے کہاں گم ہو گئیں۔ ایک گھنٹے کے بعد ہم اٹھ کر گھر جانے والے ہی تھے کہ یہ واپس آئیں اور کہنے لگیں، ''ہمارے پاس لوگ کم ہو گئے ہیں، براہِ کرم ہمارے ساتھ چلیں''۔ ہم ان کے ساتھ گئے تو انہوں نے ہمارے آگے ایک رائے دہندگان کے ناموں کی فہرست ڈال دی اور درخواست کی کہ ہم آنے والی خواتین کے نام اور پتے اس فہرست سے دیکھ کر کے انہیں رائے دہانی کا موقعہ دیں۔ وہاں دو خواتین اور بھی تھیں جو اسی طرح کا کام کر رہی تھیں۔ اب خواتین آنا شروع ہوئیں جو اپنا نام بتائے اس کا نام فہرست میں نہ ملے۔ سارے صفحے الٹ پلٹ کر دیکھے، نہ والدین کے نام ملے، نہ عمر، نہ زوجیت، اور نہ ہی پورا نام۔ حیران تھے کہ یہ کیسی فہرست کہ نمبر شمار تک ترتیب میں نہ تھے۔ اکثر ووٹروں کو اپنا پورا نام بھی صحیح نہیں پتہ تھا، کبھی کچھ نام بولیں تو کبھی کچھ، اور شوہر کے بھی ایک یا دو مختلف نام بتائیں۔ جب ہمارا اپنا ووٹ ڈالنے کا وقت آیا تو ہمارے ساتھ بھی یہی تھا،

لیکن ہماری اپنی معلومات اچھی تھیں تو ہمیں اپنا نام مل گیا اور ہم ووٹ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں حوائجِ ضروری کا انتظام بھی نہیں تھا۔ مرد گلیاں استعمال کر رہے تھے، اور یہاں کی خواتین کارکن آس پاس کے گھروں کا دروازہ کھٹکھٹا کر وہاں کی سہولتیں استعمال کر رہی تھیں۔ دوپہر سے سہ پہر ہو چلی تھی اور کھانے پانی کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ چائے بھی ہم نے اس جگہ سے باہر جا کر اپنے پیسے سے منگوا کر پی۔ ہمیں لانے کے لئے تو منتظمین میں سے ایک صاحب ہمیں لے آئے تھے، واپسی کے وقت نہ ہمیں اور نہ ہماری میزبان افسر کو کسی نے یہ پوچھا کہ آپ گھر واپس کیسے جائینگی۔ غرض خدا خدا کر کے یہ دن ختم ہوا، اور اندازہ یہی رہا کہ یہ انتخابات کم از کم حقیقی تھے، گو کہ کچھ لوگ مختلف وجوہات کی بنا اپنا ووٹ نہ ڈال سکے تھے۔

جب جنرل یحییٰ خان نے یہ اعلان کیا کہ مجیب الرحمٰن جیت گئے ہیں تو اِس پر کسی کو اعتراض نہ تھا اور نہ کسی نے انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگایا اور مجیب الرحمٰن نے اپنی کابینہ بنا کر قومی اسمبلی کا اجلاس ڈھاکہ میں کرنے کا اعلان کیا۔ اِس کے جواب میں پنجاب اور ذوالفقار علی بھٹو کی دوستی نے بھٹو کے اس مشہور جملہ کو جنم دیا کہ، ''تم وہاں خوش تو ہم یہاں خوش''۔ یحییٰ خان جب نشہ میں نہیں ہوتے تھے تب بھی ملک کے معاملات پر کم اور دوسرے معاملات پر زیادہ توجہ دیتے تھے، اور ذوالفقار علی بھٹو کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ اکثر بنگالی پاکستان سے تو شاید محبت کرتے تھے، لیکن مغربی پاکستانیوں سے نہیں۔ اس تفرقہ میں سب سے بڑا ہاتھ مغربی پاکستانیوں کا تھا۔ مجیب الرحمٰن پاکستان کے منتخب وزیرِاعظم تھے اور اب یہ صاف ظاہر تھا کہ اگر جمہوریت ہی پاکستان کا مستقبل ہونا ہوگا تو حکومت بنگالیوں کے ہاتھ میں لازم۔ یہ چیز مغربی پاکستانی برداشت نہ کر پا رہے تھے۔ لوگ بنگال کے طوفانوں اور غربت سے بیزار تھے اور عام شہری پاکستان کے دو ٹکڑے ہونا بہتر کہتے تھے۔ مغربی پاکستان کے سیاستدانوں کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ قومی اسمبلی میں شرکت کے لئے ڈھاکہ جائیں۔ غرض کچھ سماجی، کچھ معاشی، اور کچھ خودغرضی کے خیالات مل کر یہ تقسیم ضروری سمجھی جانے لگی۔ جنرل یحییٰ خان نے مارچ ۱۹۷۱ء میں کابینہ توڑ دی اور جنرل ٹکا خان نے ۳۱/ مارچ کو مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان بھیج دیا۔ مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج نے بنگالی مسلمانوں کو اس قدر بے دردی سے مارا تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت یاد آ گئی۔ پاکستانی فوج کے ایک بنگالی افسر کرنل ضیا الرحمٰن نے مکتی باہنی بنائی اور ہندوستانی فوج سے مل گئے۔ ۴/ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہندوستان نے بنگال کے عوام کی مدد کے لئے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ لاہور کی ساری یونیورسٹیاں اور کالج بند ہو گئے۔ ہمارے دوسرے صاحبزادے انجینئرنگ

یونیورسٹی سے ہمارے پاس کراچی آ گئے۔ اِدھر پاکستانی فوج نے اپنی ضرورت کے مطابق ہمارے شوہر ذاکر صاحب کو جنگ کے محاذ سے دور کے کاموں کے لئے مردان بلا لیا۔

جنگ کے دوران مختلف چیزوں کا راشن دوبارہ شروع ہو گیا۔ ہم اپنا راشن کارڈ بنوانے کے لئے لالوکھیت گئے، اور ابھی راستے ہی میں تھے کہ ہندوستانی بحریہ کی بمباری سے کیماڑی کے تیل کے ذخیرہ میں آگ لگ گئی، اور جلتے تیل کے دھویں سے پورا کراچی ڈھک گیا۔ ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا، لیکن راشن کارڈ پھر بھی بنا دیا گیا۔ گھر پہنچے تو سب لوگوں نے بالٹیوں میں مٹی بھری ہوئی تھی، اور اس میں پانی ملا کر کیچڑ بنائی جا رہی تھی۔ پھر اسی کیچڑ سے گھر کے باہر کی پوری دیواریں اور چھتیں لیپ دی گئیں۔ ہمارے ایک پڑوسی جناب کمال صاحب تھے جنہیں اُس دن سے پہلے ہم صرف ''روفی کے ماموں'' کے نام سے جانتے تھے۔ روفی ہمارے سب سے چھوٹے صاحبزادے کے ہم عمر تھے۔ غرض یہ صاحب شہری دفاع کے کارکن بن گئے اور انہوں نے ہم سے کہا کہ ہم خواتین سے عطیات جمع کریں تاکہ بمباری سے متاثر لوگوں کی مدد کی جا سکے۔ بمباری میں کراچی شہر کے کئی علاقوں میں شہریوں کے گھر بھی تباہ ہوئے تھے۔ ہم نے صبح ہی صبح اپنی بڑی لڑکی رعنا کو جو اس وقت میٹرک میں تھیں، اور اپنی مزید کچھ جاننے والیوں کو جمع کیا۔ سارا دن ہم اپنے علاقہ کے گھروں میں گئے۔ کسی نے خالی واپس نہیں کیا۔ کچھ ایسے مہاجرین سے ملاقات ہوئی جو مشرقی پاکستان میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر، جان بچا کر آ گئے تھے۔ شام تک کافی سامان اور رقم اکٹھا ہوئی جو ہم نے کمال صاحب کے حوالے کی۔ ادھر مرد حضرات نے مل جل کر جگہ جگہ خندقیں کھود لیں۔ ساری رات گولہ باری ہوتی اور طیاروں کو دیکھنے کے لئے روشنی کے گولے بھی پھینکے جاتے جس سے سارا گھر روشن ہو جاتا تھا۔ اس وقت شہری دفاع کے لوگ منہ والی سیٹیاں بجا بجا کر باہر بلاتے کہ سب چل کر خندق میں بیٹھیں، لیکن شاید ہی کوئی باہر گیا ہو۔ سب گھروں ہی میں رہتے تھے۔ ہر فیکٹری پر بم گرائے جا رہے تھے۔ بیٹے نجم اس وقت انڈس کیمیکلز میں کام کرتے تھے۔ یہ ساری رات فیکٹری میں گزارتے اور ہم ساری رات ان کے لئے دعائیں کرتے رہتے تھے۔ ہماری نظروں میں پاکستان بننے کے حالات رواں ہو جاتے اور دعائیں مانگ مانگ کر حلق خشک ہو جاتا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں قوم نے فوج کا ہر طرح سے ساتھ دیا تھا۔ بچوں نے اپنی جیب خرچ کی رقم فوجیوں کے حوالے کی اور بڑوں نے اپنے بنک اکاؤنٹ اور دل ان کے لئے کھول دیئے تھے۔ یہ جوش و خروش

ہم نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں نہیں دیکھا۔ اس دوران اور اس کے بعد، فوج نے فوجی فاؤنڈیشن، شاہین فاؤنڈیشن اور بحریہ فاؤنڈیشن بنا کر پورے ملک میں بڑی سے بڑی صنعتیں، زمینیں، بنک، ایئر لائنز، ٹرکوں کی کمپنی، سڑکیں بنانے کی کمپنیاں، اور بڑی سے بڑی عمارتیں فوج کے اپنے فائدہ کے لئے حاصل کر لی تھیں۔ ہر شہر کے اعلیٰ ترین رہائشی علاقے فوجیوں کے پاس نظر آنے لگے تھے۔ سب کو نظر آتا تھا کہ ان کے پاس یہ پیسہ کہاں سے آیا۔ لوگوں میں فوج کی عزت کم ہوگئی تھی۔ پھر مشرقی پاکستان کے حالات قوم کے سامنے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کو زبردست شکست ہوئی۔ ۱۶/دسمبر کو پاکستان کے ۹۰،۰۰۰/فوجیوں نے ہندوستان کی فوج کے آگے اپنے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ تاریخ کی سب سے بڑی فوج تھی جو بغیر بڑی جنگ کیئے ہتھیار ڈال بیٹھی۔ پوری قوم کا سر شرم سے جھک گیا۔ مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش ہوگیا۔

جنگ ہندوستان نے خود بند کی تھی۔ ان کا مقصد پورا ہوگیا تھا، بنگلہ دیش الگ ہوگیا تھا۔ ۲۰/ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھٹو صاحب ملک کے وزیرِ اعظم ہو گئے، اور پنجاب اور بھٹو صاحب کی یہ آرزو پوری ہوگئی کہ تم اُدھر تو ہم اِدھر۔ ہمارے شوہر ذاکر صاحب بھی مردان ۲۲/دن رہ کر واپس آ گئے۔ اس کے بعد ہندوستان سے سفارتی تعلقات کافی عرصہ بند رہے۔ پاسپورٹ پر ملکوں کی فہرست سے ہندوستان کا نام نکال دیا گیا تھا۔ اگر ہمیں جانا ہوتا تو پاسپورٹ پر ایک خاص مہر لگائی جاتی، جس کے تحت پاسپورٹ صرف ایک سال کے لئے ہندوستان کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ہمارے ہندوستان کے سفر بند ہو گئے۔

کراچی ۔ آمد و رفت

ہم نے ایک مزید معمولی سی تبدیلی کی، اور وہ یہ کہ ہم ایک نئے گھر میں منتقل ہو گئے۔ اِس گھر سے ذاکر صاحب نے اپنی کمپنی ٹرانسگلوب شپنگ سروسز کی بنیاد ڈالی اور اس کا دفتر غفور چمبرز، وکٹوریہ روڈ پر کھولا۔ ہمارے تیسرے صاحبزادے قمر اس وقت تک سراج الدولہ کالج سے کامرس کی ڈگری، بی کام لے چکے تھے۔ انہوں نے ذاکر صاحب کے ساتھ اس کمپنی میں کام شروع کر دیا۔ اسی گھر میں بیٹے شمس کو ۱۹۷۴ء میں انجینئرنگ کی ڈگری ملی، اور یہ مختلف کمپنیوں سے ہوتے ہوئے پی آئی اے (PIA) میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۴ء میں ہمارے بڑے بیٹے نجم کی شادی ہوئی اور یہ اپنی بیگم سمیت قریب ہی ایک گھر میں منتقل ہو گئے۔ ۸/ستمبر ۱۹۷۵ء کو اِن سے ایک بیٹی اور ہماری تیسری نسل کی آمد ہوئی۔ غرض کہ ہمارے لئے یہ گھر بہت اچھا رہا۔

پاکستان آنے کے بعد ہماری زندگی مسلسل ہجرتوں میں رہی تھی، اور سات بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے سلسلے میں ذاکر صاحب اور ہم سب نے سخت محنت کی تھی۔ اب ان محنتوں کا پھل آنے لگا تھا۔ اب خیال ہوا کہ ہندوستان میں اپنی بہن سے مل آئیں۔ ہم نے اپنا پاسپورٹ دوبارہ ہندوستان کے سفر کی مہر لگنے کے لئے جمع کرایا۔ دو دن بعد ہی ہمارے شوہر صاحب پر ایک جیب کترے نے حملہ کر دیا اور اُن کے پیٹ میں شدید اندرونی چوٹ آئی۔ انہیں سول ہسپتال میں ایک سرجری کے بعد خون دیا گیا۔ ہمارے شوہر کے خون کی قسم او (O) تھی۔ یہ خود ہر ایک کو خون دے سکتے تھے، لیکن صرف اپنی ہی قسم والے کا خون لے سکتے تھے۔ ہمارے بچوں میں کسی کا یہ خون نہیں تھا۔ ذاکر صاحب کے لئے خون ہسپتال سے لیا گیا۔ اُس زمانے میں خون کے عطیہ میں صرف خون کی قسم دیکھتے تھے، خون کی بیماریاں نہیں۔ اس خون سے انہیں پیلیا (یرقان) ہو گیا اور وہ جگر کی تخریب سے ۵/نومبر ۱۹۷۵ء کی رات اس جہانِ فانی سے ہجرت کر گئے۔ ۸/نومبر کو ہمارا پاسپورٹ تمام مہروں کے ساتھ ہمیں ملا، لیکن ہم ہندوستان کا سفر اگلے پانچ سال تک نہ کر سکے۔

اگلے چار سال ۔ کراچی اور پاکستان کا حساب کتاب

ذاکر صاحب کے انتقال کے بعد ہمارے خاندان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ہم سب یہی کوشش کرتے رہے کہ اپنے کام میں جس قدر مصروف ہو سکتے ہیں رہیں۔ اعزاز نے کراچی کے نیشنل کالج سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کر کے سندھ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا، اور وقت کے ساتھ ساتھ ہماری بڑی بیٹی نے ایم اے اکنامکس میں پوزیشن لے کے الائیڈ بنک آف پاکستان میں شمولیت کر لی۔ ٹرانسگلوب شپنگ سروسز کو ہمارے تیسرے صاحبزادے قمر نے سنبھال لیا۔ ذاکر صاحب کے کراچی شہر میں بہت جاننے والے تھے اور پاکستان کسٹمز اور کراچی پورٹ ٹرسٹ میں اوپری افسروں سے ان کی اچھی واقفیت تھی۔ ان سب نے ہمارے صاحبزادے کا ہر ممکن ساتھ دیا۔ دوسری طرف قمر نے دن رات محنت کی اور اس کمپنی کو بہت اوپر لائے۔ اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت یہ کمپنی اپنی نوعیت کی پاکستان کی دس بڑی کمپنیوں میں سے ایک کہی جاتی ہے۔

سیاسی دنیا میں ذوالفقار علی بھٹو ۱۹۷۳ء میں ملک کے وزیرِ اعظم بن چکے تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے تمام بنکوں، انشورنس کمپنیوں، فیکٹریوں اور اسکولوں کو قومیا لیا۔ پاکستان کی معشیت کو اس سے زیادہ نقصان کسی اور چیز سے نہیں ہوا۔ اس غلطی کا خمیازہ قوم ابھی تک ادا کر رہی ہے، اور اس کا اندازہ جلد ہی ہو گیا

تھا۔ بھٹو صاحب کے خلاف ہنگامے شروع ہو گئے تو مارچ ۱۹۷۷ء میں پارلیمانی طور وطریقہ سے دوبارہ انتخابات ہوئے جسے تقریباً تمام سیاسی جماعتوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ ملک میں حالات پھر ''حسبِ معمول'' ہو گئے۔ روزآنہ پہیہ جام ہڑتالیں، سڑکوں کی تمام بتّیوں کی توڑ پھوڑ، اور چھینا جھپٹی شروع ہوگئی۔ ۵/جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل ضیاء الحق نے ٹیلی ویژن پر ملک میں مارشل لاء لگانے کا اعلان کیا تو ہم مٹھائی کی دُکان پر کھڑے ہوئے جلیبیاں خرید رہے تھے۔ سب اتنے خوش ہوئے کہ دُکاندار نے لوگوں کو ایک ایک جلیبی مفت بانٹی۔ اس کی کڑھائی کی جلیبیاں ختم ہوگئیں تو ہمیں اپنی جلیبیوں کے لئے وہیں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑا، اور اس طرح ضیاء صاحب کی تقریر ہم نے وہیں دیکھی۔ پہلی تقریر میں یہ انتہائی دیانتدار اور دیندار آدمی لگے، ایک قرآنی آیت پڑھ کر ۹۰/دن میں دیانتدار انتخابات کرانے کا وعدہ کیا۔ لیکن آنے والے وقت نے کچھ اور دکھایا۔ ستمبر ۱۹۷۸ء میں یہ صاحب چودھری فضل الٰہی کو برخواست کر کے خود ملک کے صدر بن گئے۔ فروری ۱۹۷۹ء میں انہوں نے ملک میں شرعی قانون نافذ کر دیا۔ اِدھر افغانستان میں روس نے حملہ کیا ہوا تھا، اور امریکہ کو جنرل صاحب کی ضرورت تھی۔ سو اِن کی حکومت پکّی ہوگئی۔ کراچی میں افغان مہاجرین کی آبادی بڑھ گئی۔ پنجاب میں اُن پر سختی تھی، یہ وہاں سے کراچی روانہ کر دیئے جاتے تھے۔

جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں پاکستان کے صوبے آپس کے ہنگاموں میں گھِر گئے۔ بعد میں نواز شریف کے زمانے میں یہ چپقلش کچھ اور بڑھی۔ ایک طرف سندھ اور پاکستان میں کوٹہ سسٹم سندھ کے دیہی علاقوں کے سندھیوں کے حق میں رہا جس سے مہاجر ناخوش رہے، اور دوسری طرف کہا جاتا ہے جنرل صاحب نے اس وقت مہاجر قومی محاذ (سابقہ ''مہاجر قومی موومنٹ'') کو پوری مدد دی تاکہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی اور دوسری سیاسی پارٹیوں کے خلاف جنرل صاحب کی مدد کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ کی آبادی ایک نہ ہو پائی۔ آج سندھی اور مہاجر دونوں گلے مِل کر ہاتھ مَل رہے ہیں۔